© rasailojaraid.com

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مولانا عبید اللہ — چند مشاہدات

اس مقالے کے فاضل مولف مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم اردو کے اہلِ قلم، مفکر اور اسلامیات کے بلند پایہ اسکالر تھے وہ دارالعلوم دیوبند کے فرزند سعید تھے ندوۃ المصنفین کے بیکے از بانیان و رفیق علمی اور ماہنامہ برہان کے ایڈیٹر تھے۔ ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں انتقال فرمایا۔

مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمہ سے انھیں خاص تعلق اور عقیدت تھی انھوں نے مولانا سندھی مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور ان کے افکار سے مستفید ہوئے تھے، جب بعض حضرات مولانا سندھی کو ناہنجارانہ تنقید کا ہدف بنایا تو انھوں نے مولانا سندھی کے دفاع کا فریضہ نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔

زیرِ نظر مضمون مولانا اکبرآبادی نے روزنامہ نئی دنیا دہلی کے ایڈیٹر کی فرمائش پر اس کے مولانا حسین احمد مدنی رح نمبر کے لئے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اور جن مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ وہ نہایت فکر انگیز ہیں۔

آج اگر کوئی فلسفہ ملک کے مختلف طبقات کے لئے مشترک بنیاد بن سکتا ہے، مسائل کے ہجوم اور اختلافات میں روشنی کی کوئی کرن ہے اور ملک کو موجودہ حالاتِ انتشار سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فلسفہ ہے جس کے سب سے بڑے شارح امام امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس لئے آج کے دور میں مولانا سندھی مرحوم کے افکار کے مطالعے کی معنویت بہت بڑھ گئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس پس منظر میں یہ مضمون قارئین الولی خاص شوق اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

(ڈاکٹر) ابوسلمان شاہجہاں پوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا عبیداللہ سندھی کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا کے علم وفضل اور مجاہدانہ کارناموں کا ذکر لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے تھے۔ اور ان کو سُن سُن کر دل میں جذبہ اور ولولہ اٹھتا تھا کہ اے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جائیں اور آنکھیں ان کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ آخر خدا نے دل کی یہ مراد پوری کی اور ۱۹۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تقریباً پچیس برس کی جلا وطنی کے بعد ہندوستان تشریف لا رہے ہیں اور جہاز سے کراچی اتر کر سیدھے دلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھڑی گننی شروع کر دی اور مولانا کی آمد کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر ہم نے اس وقت مولانا کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ عمامہ سر پر ہوگا۔ جبہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ہمراہ ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس، ایک بھاری بستر، ہمراہ اس کی بوتلیں، تین بھاری اور وزنی ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھومتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدر کا کرتا اور پاجامہ پہنے اور ایک سفید کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوئے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبیداللہ سندھی ہیں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سپید تھے عمر ۶۵ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی۔ مگر جسم مضبوط اور ڈھلا ہوا، آنکھوں میں غیر معمولی چمک، پیشانی پر مجاہدانہ عزم و ہمت کے کس بل، آواز میں طنطنہ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک ایسا جلال کہ گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آگیا۔ اور اس نے ایک دوسرا مورچہ سنبھال لیا۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں۔ مگر وہاں سامان کہاں تھا، جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا بس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا کا نام۔ میں نے دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی، تارکین دنیا بھی دیکھے اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔

دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی۔ اس لئے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسبِ معمول حاضر ہوا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی جب میں رخصت ہوا تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے۔ اور سڑک پر کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بڑی موٹر کار ہمارے پاس آکر رکی اور موٹر کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس کے لیے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا "کب"؟ سیٹھ صاحب نے کہا "بس ابھی" سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ نہ کمرہ میں گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا، وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن رکھے ہوئے تھے تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے مولانا کا کچھ نہ تھا۔

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہوگئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلّی کی جامعہ مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے مغرب جنوب میں حکیم نابینا مرحوم کا مشہور مطب تھا اور اس مطب سے بالکل متصل ہمارے ایک دوست محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان تھا جس کے ایک کمرہ میں ادارۂ شرقیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ اس ادارہ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی بھی جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے تھے۔ چند روز کے بعد ہم لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ درس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکال لی اور اس پر تقریر شروع کردی۔ تقریر ختم ہونے کے بعد ہم لوگ سوالات کرتے تھے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے اس مجلس میں دیوبند کے فضلا جو دلّی میں مقیم تھے وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند اور ارباب علم شریک ہوتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا؟ مولانا سندھی حسبِ معمول اوکھلے سے دلّی آئے جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارہ شرقیہ میں تشریف لاکر حسب معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا اس وقت چہرہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تکان کا کوئی اثر اور نہ آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف، کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر دماغی کے ساتھ حصہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے پتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن اور ایک آنہ کی روٹی۔ میں نے کہا "حضرت بے وقت کھانا کیسا؟ فرمایا "اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا"۔

یہ تو خیر ہوا ہی اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا۔ اور چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے اس لئے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلی آٹھ میل پا پیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل پا پیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا بلکہ جامعہ نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت کیا اور مولانا نے اس کی تصدیق کی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اس روز مولانا کو پیدل آنا تھا اس لئے اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا۔ اور چونکہ اس وقت تک کھانا تیار نہیں ہوا تھا اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی نے مولانا سے پوچھا کہ "حضرت! آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے؟" حسب عادت بپھر کر بولے "مفتی جی! آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کسی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔ میری خدمت میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا" اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا حضرت! پچیس برس کی جلاوطنی کے زمانہ میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے ہیں؟ فرمایا! مفتی صاحب! یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں چین اور آرام سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سو یا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر پچیس برس کے بعد پہلی مرتبہ میں سکون کی نیند سویا ہوں

مولانا ہمیشہ ننگے سر رہتے تھے ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا "مولانا آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کے ساتھ فرمایا "میری ٹوپی تو اس دن میرے سر سے اتر گئی کہ جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں"۔

مولانا کا فی عرصہ سے بڑھتے عمر کا بڑا حصہ جلا وطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا۔ اور بے زر و سرمایہ تھے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی روشنی میں انھوں نے اس پر مسلسل غور و فکر کیا تھا کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالم گیر طاقت بنایا جائے جس کا کہ وہ دین فطرت ہونے کے باعث بجا طور پر مستحق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اسلام کے اجتماعی، اقتصادی اور سماجی نظام کا بڑی دقتِ [illegible] سے مطالعہ کیا تھا۔ اور دوسری جانب انھوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے [illegible] دنیا میں عظیم الشان صنعتی انقلاب ہوا اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل اور عام معاشرہ پر پڑ رہے ہیں ان سب کا دیدہ وری اور عمیق بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ اور اس کے بعد انھوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ کا وثوق اور اعتماد تھا۔ جلا وطنی سے واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان [illegible] سمجھیں اور اس کی بنیاد پر سوسائٹی کی از سر نو تشکیل و تعمیر کریں۔ چنانچہ انھوں نے وطن آنے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں جو مقالات و مضامین لکھے اور جو رسالے تالیف کئے ان کے عمق اور ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دُھن تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کو اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ اتنے بڑے انشاء پرداز، بات بہت گہری اور پتے کی کہتے تھے۔ مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ اچھے اچھے اہل علم اور مفکرین بھی ان سے بدظن ہو جاتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت اور غیر مصالحانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی کبھی اس کا اعتراف کرتے تھے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ میں کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہ پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح اپنے الفاظ میں لکھ ڈالوں۔ اس اہم کام کے لئے مجھ ایسے ہیچمداں کا مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ اس بناء پر میرے لئے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں اس کے لئے آمادہ ہو گیا اور قرار داد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اوکھلے سے دلّی آئیں گے اور مسجد فتحپوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کریں گے۔ ادھر میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مکان قرول باغ سے مسجد فتحپوری میں آجاؤں گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریر درس کو اپنے الفاظ میں قلمبند کر کے ان کو دکھا دوں گا۔ یہ قرار داد ہو چکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پنجاب کا سفر پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں جلد واپس آجاؤں گا۔ اور آتے ہی یہ پروگرام شروع ہو جائے گا۔ لیکن آہ کسے خبر تھی کہ مولانا کا دلّی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جو لاہور میں تھیں۔ وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی بیمار ہوئے اور اس قدر شدید کہ جان ممکن نہ ہوئی اور داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مشیت ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ آج مولانا دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا جو گرانبہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ اس لائق ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا غور و فکر سے مطالعہ کرے۔ اس سے نئی راہیں سامنے آئیں گی۔ اور نتائج فکر کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو زندگی کی اصولوں کو منور کرے گی۔ اور صحیح ... قرآن سامنے آ جائے گا۔

بقیہ: شذرات

... اس کا اصل تعلق انسان کو خالق کائنات سے ملے گا۔ لیکن یہ دور اجتماعیت اور مل کر کام کرنے کا ہے اس میں بیت المال بنانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ تالیف قلوب سے بھی کام لیا جائے۔

مولانا آزاد کے ہاتھ پر اکثر مسیحی لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اصل میں یہ لوگ مسلمان ہی تھے۔ اور ان کے نام بھی مسلمانوں کے ہوتے تھے جو بعد میں مسیحی پادریوں کے نرغے میں آگئے اور مسیحی بن گئے۔ ہمارے علمائے اسلام نے بھی کوئی خیال نہیں کیا کیونکہ ان کے ہاں تبشیر والوں کی طرح کوئی تبلیغی ادارہ نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی بیت المال تھا۔ مولانا آزاد صاحب بیسیوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پاکستان کے علمائے اسلام کو بھی مولانا آزاد سے ... [illegible]

© rasailojaraid.com